Dr shyama parsad mukharjee university,Ranchi

B.A Sem-02

Sub-Urdu, HC-202

درج ذیل معروضی سوالات کا جواب دیجیے۔

(i) ہاسٹل میں پڑھنا کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) ڈپٹی نذیر احمد (ب) پطرس بخاری (ج) فرحت اللہ بیگ

(ii) یادگار غالب کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(الف) خاکہ (ب) سوانح (ج) خودنوشت

(iii) غالب کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) دلی (ب) لکھنؤ (ج) آگرہ

(iv) حالی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) پانی پت (ب) سونی پت (ج) باغ پت

(v) یادگار غالب کے مصنف کون ہیں؟

(الف) فرحت اللہ بیگ (ب) حالی (ج) پطرس

(vi) نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی۔۔۔ کے مصنف کون ہیں؟

(الف) غالب (ب) فرحت اللہ بیگ (ج) رشید احمد

(vii) مرزا غالب کب پیدا ہوئے؟

(الف) 1857ء (ب) 1869ء (ج) 1797ء

(viii) غالب کی وفات کہاں ہوئی؟

(الف) دلی (ب) لکھنؤ (ج) آگرہ

(ix) پطرس بخاری کی وفات کہاں ہوئی؟

(الف) پاکستان (ب) نیو یارک (ج) لندن

(x) مضامین پطرس میں کتنے مضامین شامل ہیں؟

(الف) 10 (ب) 11 (ج) 12

subjective

(2) انشائیہ کسے کہتے ہیں، اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

(3) سوانح نگاری پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔

(4) خاکا نگاری سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

(5) مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکا نگاری کا جائزہ لیجیے۔

(6) حالی کی سوانح نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

(7) انشائیہ ہاسٹل میں پڑھنا کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

(8) ولی دکنی کی حالات زندگی پیش کریں۔

(9) غالب کی خطوط نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔

B.A. Semester II

URDU- HC-202

Scanned with CamScanner

1.4.1 سوانح

اردو میں سوانح نگاری سے قبل تذکرہ کی صنف کو شہرت حاصل تھی۔ کسی بھی نامور شخص کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا رواج عام نہ تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے سوانح نگاری کی بنیاد رکھی۔ سوانح میں کسی مشہور شخص کی زندگی کے محاسن اور معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی سوانح عمری میں صرف محاسن بیان کیے جائیں تو ایسی سوانحی کتاب تصویر کے ایک رخ کی نمائندگی کرے گی جب کہ معائب کا ذکر سوانح کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ سوانح میں مستند اور جامع مواد کی پیش کشی ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جارہی ہے اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو کتاب میں سلسلہ وار بیان کردیا جائے۔ اگر یہ رویہ کسی سوانح میں اختیار نہ کیا جائے تو ایسی سوانح بلاشبہ ادبی معیارات کی تکمیل نہ کرسکے گی۔ مولانا حالی کو اردو کے اولین اور سب سے بہترین سوانح نگار کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ''حیات سعدی'' اور پھر اس کے بعد ''یادگار غالب'' اور پھر سب سے آخر میں ''حیاتِ جاوید'' لکھ کر اردو ادب میں سوانح کی بنیاد رکھی۔ مولانا حالی کے بعد شبلی نعمانی اور پھر ان کے بعد اردو کے بیشتر ادیبوں نے سوانحی ادب کی ترقی میں حصہ لیا اور بے شمار سوانحی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ سوانح میں نہ تو شخصیت کے بارے میں فرضی واقعات بیان کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیز اسلوب اختیار کرکے اس صنف کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی کو سوانح عمری کی صدی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے پاک انسانوں کی سوانح لکھ کر اردو میں ''سیرت نگاری'' کی بنیاد رکھی۔ ان کی کتابیں سیرت النبیؐ المامون، الغزالی اور الفاروق اردو سیرت کی اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

کسی موضوع پر اظہارِ خیال کیا جائے تو اسے انشائیہ قرار دیا جاتا ہے۔ انشائیہ
یں Essay کا لفظ مروج ہے۔ دکنی میں لکھی گئی وجہی کی نثری کتاب ''سب
اس میں موجود ہیں، لیکن اکثر نقاد اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا
ئی کیونکہ سرسید نے لندن کے اخبارات اور انگریزی رسالوں کے مطالعہ کے
ق ہے اور جب وہ لندن سے ہندوستان لوٹے تو ''ایسے'' کو اردو میں رواج
س لی۔ انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں ایسے بے شمار مضامین شائع کیے جن میں بے تکلفی، بے ساختہ پن اور فکر کی گہرائی موجود تھی۔ یہی
پنے مواد اور متن کے اعتبار سے اردو کے بہترین انشائیے قرار دیے گئے۔ گو کہ انشائیوں کے ابتدائی ''نقوش'' سرسید سے پہلے بھی ملتے ہیں
ہ انشائیہ نگاری کا آغاز سرسید سے ہوا اور سرسید نے جس قدر انشائیے لکھے انہیں ''مضامین سرسید'' کے نام سے شائع کیا گیا
ی نگاری کا آغاز ہو چکا تھا اور مختلف عنوانات پر مضامین لکھنے کی روایت بھی

1.4.2 انشائیہ

مضمون کا ایک ایسا ہلکا پھلکا انداز جس میں بے ساختہ بے تکلفانہ کسی موضوع پر اظہارِ خیال کیا جائے تو اسے انشائیہ قرار دیا جاتا ہے۔ انشائیہ کی تعریف میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ''انشائیہ'' کے لیے انگریزی میں Essay کا لفظ مروج ہے۔ دکنی میں لکھی گئی وجہی کی نثری کتاب ''سب رس'' کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش اس میں موجود ہیں' لیکن اکثر نقاد اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صنف سرسید کے انگلستان کے سفر کے بعد عالم وجود میں آئی کیونکہ سرسید نے لندن کے اخبارات اور انگریزی رسالوں کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس کیا کہ مضمون کے ذریعے بھی سماجی اور ثقافتی تبدیلی لائی جاسکتی ہے اور جب وہ لندن سے ہندوستان لوٹے تو ''ایسے'' کو اردو میں رواج دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں ایسے بے شمار مضامین شائع کیے جن میں بے تکلفی' بے ساختہ پن اور فکر کی گہرائی موجود تھی۔ یہی مضامین اپنے مواد اور متن کے اعتبار سے اردو کے بہترین انشائیے قرار دیے گئے۔ گو کہ انشائیوں کے ابتدائی ''نقوش'' سرسید سے پہلے بھی ملتے ہیں لیکن باقاعدہ انشائیہ نگاری کا آغاز سرسید سے ہوا اور سرسید نے جس قدر انشائیے لکھے انہیں ''مضامین سرسید'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ سرسید سے قبل اگرچہ مضمون نگاری کا آغاز ہو چکا تھا اور مختلف عنوانات پر مضامین لکھنے کی روایت بھی عام ہو چکی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مضمون اور انشائیہ دو مختلف قسم کے طرزِ اظہار ہیں۔ انشائیہ میں مضمون کی خصوصیات نہیں ہوتیں بلکہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں اپنی تحریر کا موضوع بناتا ہے' جس کی وجہ سے مضمون اور انشائیہ میں موجود فرق کو محسوس کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ سرسید کے بعد نذیر ناصر' فراق دہلوی' خواجہ

Scanned with CamScanner

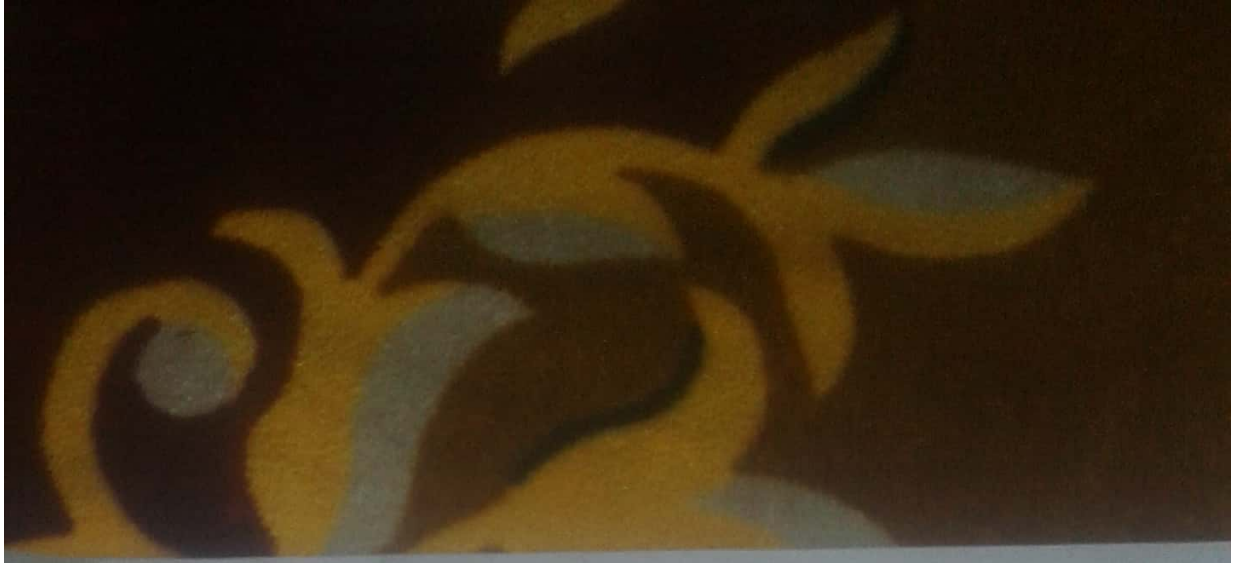

حسن نظامی اور دوسرے قلم کاروں نے انشائیہ کی صنف میں مزید اضافے کیے۔ ظہیر الدین مدنی نے اپنی کتاب "اردو انیز" میں یہ بات واضح کی ہے کہ انگریزی لفظ "ایسے" کا کوئی متبادل نہیں ہو سکتا اور انہوں نے انشائیہ کو "ایسے" کا ہم معنی لفظ قرار نہیں دیا جب کہ پروفیسر سید وجعفر نے اپنی کتاب "ماسٹر رام چندر" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انگریزی لفظ Essay "ایسے" کے لیے اردو میں متبادل لفظ "مضمون" استعمال کیا جا سکتا ہے۔ غرض اس بحث سے قطع نظر اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انشائیہ ایک غیر افسانوی صنف نثر ہے جس میں انشائیہ نگار کے تجربات اور احساسات کا دخل ہوتا ہے جب کہ مضمون میں موضوع سے متعلق حقائق کی ترسیل ہوتی ہے۔ اس طرح مضمون اور انشائیہ دو الگ الگ اصناف ہیں لیکن دونوں اصناف کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔

Scanned with CamScanner

4. انشائیہ کے لیے انگریزی میں متبادل لفظ کیا ہے؟

1.4.3 خاکہ

خاکہ نہایت مختصر سے عرصے میں اردو ادب کی اہم صنف بن گیا ہے۔ اختصار نویسی کے اس دور میں خاکے کو سوانح پر ترجیح دی گئی ہے۔ انگریزی ادب میں خاکے کے لیے Sketch کا لفظ مروج ہے۔ خاکہ درحقیقت ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح مضمون میں مختلف موضوعاتی نکات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے اسی طرح خاکہ میں کسی ایک شخصیت کی زندگی کے اہم نکات کی دلچسپ انداز میں نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار، کردار اور کارناموں کے اہم نقوش واضح کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں طویل سوانح سے زیادہ دلچسپ مواد پیش ہوتا ہے، گو کہ خاکے میں سوانحی مواد بھی شامل ہوتا ہے لیکن ایک خاکہ نگار کو بنیادی طور پر شخصیت کے تمام گوشوں کی نشاندہی کی ضرورت نہیں بلکہ وہ مختصر انداز میں شخصیت کی مرقع کاری کا کام انجام دیتا ہے۔ اس اعتبار سے خاکہ نگاری کی صنف سوانح سے ضرور استفادہ کرتی ہے لیکن اپنے انداز کی وجہ سے خاکہ بذات خود صنف نثر کا ایسا زبردست طرز اظہار ہے جس میں شخصیت کے منفی اور مثبت دونوں رویوں کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ کہا گیا کہ خاکہ نگاری ایسا فن ہے جس میں نگینہ چننے کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کے ہلکے نقوش سب سے پہلے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور تصنیف ''آب حیات'' تحریر کی تھی، اس کتاب میں شامل مختلف شخصیتوں کے حالات میں خاکوں کے ادھورے نقوش تو ابھرتے ہیں لیکن مرقع کاری کا انداز مفقود ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کو اردو کی پہلی طویل خاکہ نگاری کی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی نے اہم شخصیتوں کی رحلت پر ''وفات نامے'' تحریر کیے لیکن ان وفیات کو خاکہ کی صنف میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ خاکہ کی صنف کو فنی اور اصولی طور پر اردو میں رواج دینے والے ادیبوں میں مولوی عبدالحق کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف ''چند ہمعصر'' اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نمونوں میں سے ہے۔ مولوی عبدالحق کے بعد خاکہ نگاری کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ'' شاہد احمد دہلوی نے ''دلی کی اہم شخصیتیں'' اشرف صبوحی نے ''دلی کی عجیب وغریب شخصیتیں'' لکھ کر خاکہ نگاری کے فروغ میں اپنی خدمات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ترقی پسند مصنفین کے توسط سے خاکہ نگاری کی صنف کو عروج حاصل ہوا اور دورِ حاضر میں بھی یہ صنف اردو نثر کی ایک مایہ ناز صنف کا درجہ رکھتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. خاکہ کے لیے انگریزی میں کون سا لفظ مروج ہے؟

Scanned with CamScanner

(۸)

خاکا

خاکا نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔ اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ مراد یہ کہ افسانہ و غزل کی طرح یہاں بھی اشارے کنایے سے کام لیا جاتا ہے کیوں کہ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ایک چیز ایسی ہے جو خاکے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ جس کا خاکا پیش کیا جا رہا ہے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں اس کے لیے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا کریں اور خاکا پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی نہ ہوتیں۔

مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور رشید احمد صدیقی نے "کندن" کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ خاکے کا موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکا لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ خاکا نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خاکا نگار کا قلم مردہ جسم میں جان ڈال دینے کے ہنر سے واقف ہو۔

خاکا نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی سی تصویر ہے۔

Scanned with CamScanner

اس میں نہ اس کی زندگی کے اہم واقعات کی گنجایش ہے نہ خاص خاص تاریخوں کی اور نہ زیادہ تفصیل کی۔ مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابلِ ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انھیں دلچسپ انداز سے بیان کر دے تو یہی خاکا ہے۔ مصنف نے یہ خصوصیات بچشم خود دیکھی ہوں تو کیا کہنا۔ منٹو نے "میرا صاحب" لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی ایک کامیاب خاکا لکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے محمد علی جناح کے ڈرائیور سے اس کے صاحب کے حالات سنے اور یہ خاکا لکھ کر ان کی زندہ جاوید تصویر بنا دی۔

آغاز و ارتقا

اردو میں باقاعدہ خاکا نگاری کا آغاز تو حال میں ہوا لیکن شعرائے اردو کے تذکروں میں اس کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ میر کے "نکات الشعرا"، مصحفی کے "تذکرۂ ہندی"، شیفتہ کے "گلشنِ بے خار"، قدرت اللہ قاسم کے "مجموعۂ نغز" اور سعادت یار خاں کے "خوش معرکۂ زیبا" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" ایک ایسی کتاب ہے جس میں بیسیوں چلتی پھرتی اور منھ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اسے تصویروں کا خوبصورت البم کہا جائے تو بجا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی دوسری کتاب "دربارِ اکبری" بھی اہم ہے۔ انشا کی "دریائے لطافت" میں بھی چند شخصی تصویریں نظر آتی ہیں۔

عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی خاکوں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خاکا نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔ انھوں نے نذیر احمد کا خاکا لکھ کر اردو میں خاکا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور خاکے بھی لکھے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس طرف توجہ کی۔ مختلف شخصیتوں پر وہ مسلسل مضامین لکھتے رہے جو بعد کو کتابی شکل میں شایع ہوئے۔

Scanned with CamScanner

رشید احمد صدیقی کو بھی شخصیات سے دلچسپی رہی ہے اور انھوں نے بہت سے خاکے لکھے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ایک منصوبے کے تحت شخصیتوں کے خاکے لکھے جاتے رہے لیکن ان مصنفین کی نظر اشخاص سے زیادہ تحریک پر تھی اس لیے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم ان کی توجہ حقیقت نگاری پر رہی۔ عصمت چغتائی اور منٹو نے بھی بہت اچھے خاکے لکھے۔ اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی بھی اہم خاکہ نگار ہیں۔ پاکستان میں بھی اس صنف نے خوب ترقی کی ہے۔ طفیل احمد اور مشتاق احمد یوسفی کے لکھے ہوئے خاکے بہت جاذب نظر ہیں۔ نثری اصناف میں خاکہ نگاری بہت مقبول ہے۔ یقین ہے کہ یہ صنف برابر ترقی کرتی رہے گی۔

اہم خاکہ نگار

مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۸۳۰ء - ۱۹۴۷ء

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد کا خاکہ "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی ایسی مستحکم بنیاد ڈالی کہ اردو میں ہر طرف اس صنف کے قدردان پیدا ہو گئے۔ مرزا دہلی کے رہنے والے تھے اور دلی کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ عربی کے پروفیسر کے اچانک چلے جانے کے سبب انھیں اس مضمون میں رہنمائی کی ضرورت پیش آئی اور ان کی رسائی مولوی نذیر احمد تک ہو گئی۔ بلا ناغہ روز ان کے یہاں پڑھنے جانے لگے۔ اس دوران مولوی صاحب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کہ خاکے کے لیے ضرورت سے زیادہ مواد فراہم ہو گیا۔ بہت کچھ لکھ بھی لیا مگر یہ سوچ کر پھاڑ ڈالا کہ "اپنچن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ رہ رہ کر جوش آتا اور ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی صاحب کا انھوں نے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کر دینے پر آمادہ کیا۔" آخر کار ۱۹۲۷ء میں یہ خاکہ شایع ہوا اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

مصنف نے اس میں مرقع نگاری کا ایسا کمال دکھایا ہے کہ آج تک اہل قلم کو اس پر

رشک آتا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کا ڈیل ڈول حلیہ، حرکات و سکنات، عادات و اطوار اس ہنرمندی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں کہ مولوی صاحب نظروں کے آگے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ فرحت اللہ بیگ نے ان کی کمزوریاں بھی بے کم و کاست بیان کر دی ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ "اب تک جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا چاہے کوئی برا مانے۔ جہاں مولوی صاحب کی خوبیوں کو دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے۔" مولوی صاحب چونکہ ایک ظریف انسان تھے اس لیے ظریفانہ انداز میں ان کا خاکا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان کی دوسری کامیاب کوشش "دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ" ہے۔ اسے متعدد مرقعوں کا البم کہا جا سکتا ہے۔ یہ ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا۔ انھوں نے "ایک وصیت کی تعمیل میں" کے عنوان سے مولوی وحید الدین سلیم کا خاکا بھی خوب لکھا ہے۔

مولوی عبدالحق

۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء

اردو خاکا نگاری کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی وہ اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف شخصیتوں کے بارے میں لکھتے رہے۔ عام طور پر انھوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب کسی کی وفات کی خبر ملی۔ بعد کو یہ خاکے "چند ہم عصر" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شایع ہوئے۔

- مولوی صاحب کی خاکا نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غیر اہم شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے نام دیو مالی کی بڑی جاذبِ نظر تصویر پیش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ نیکی کسی کی جاگیر نہیں۔ کسی نادار اور معمولی انسان میں بھی ایسی خوبیاں ہو سکتی ہیں جو اسے زندۂ جاوید بنا دیں۔ نام دیو جفاکش فرض شناس مالی تھا۔ اسے اپنے پیشے سے پیار تھا اور خدمتِ خلق سے اسے تسکین ملتی تھی۔ نور خاں کا خاکا بھی بہت دلکش ہے۔ وہ ایک

اپنی معلومات کی جانچ:

1. قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کی نوعیت کیا ہے؟
2. 'آبِ حیات' کو خاکہ نگاری اولین البم کیوں کہا جاتا ہے؟

3.3 فرحت اللہ بیگ اور معاصر خاکہ نگار

مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر کی تصنیف سیر رجال و نسواں، اور مرزا ہادی رسوا کی وضع دارانِ لکھنؤ میں بھی معروف و غیر معروف افراد کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے دلی کی چند شخصیات کو ''قلمی چہرے'' کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے حسرت موہانی پر ایک خوبصورت خاکہ ''خانی خاں'' لکھا۔ لیکن صنف خاکہ نگاری ہنوز کسی اور کے نوکِ قلم کی منتظر تھی..... اور یہ کارنامہ انجام دیا مرزا فرحت اللہ بیگ نے۔ جنھوں نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے عنوان سے جو 1927ء میں ایک طویل خاکہ لکھا وہ خاکہ نگاری کی عمارت کے لیے ایک مستحکم بنیاد ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فنی اعتبار سے اُردو خاکہ نگاری کی اولیت کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔ انہوں نے ایک عمدہ خاکہ تحریر کیا اور اس کے اصول و ضوابط بھی متعین کر دیے۔

ڈپٹی نذیر احمد، مرزا فرحت اللہ بیگ کے استاد تھے۔ دورانِ طالب علمی انہیں قریب سے شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ فرحت اللہ بیگ ان کی شخصیت کی علمی، ادبی، قابلیت اور صلاحیت کے مداح تھے۔ استاد کی نصیحت اور ہمت افزائی نے استاد اور شاگرد کے رشتہ کو اور بھی مستحکم بنا دیا۔ فرحت اللہ بیگ کو اپنے استاد سے ایک خاص تعلق خاطر، لگاؤ اور عقیدت ہوگئی تھی۔ چنانچہ اپنے استادِ محترم کی دلچسپ باتوں اور واقعات کو قلمبند کر کے ان کی جیتی جاگتی شخصیت منعکس کر دی۔ کتاب کے دیباچہ میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے خاکہ نگاری کی خصوصیات پر واضح روشنی پڑتی ہے لکھتے ہیں:

> ''اب جو کچھ کانوں سے سنا آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا تاکہ مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کو خوش کرنے اور جلانے کے لیے لکھی گئی ہو۔''

غرض مرزا فرحت اللہ بیگ نے شخصیت کے ابھارنے میں ان ہی واقعات کا انتخاب کیا ہے جو ان کے تجربے اور مشاہدے میں آئے ہیں یا پھر مولوی نذیر احمد کی زبانی سن چکے تھے۔ مولوی نذیر احمد کی شخصیت میں زندہ دلی، خوش مزاجی اور شگفتہ بیانی موجود تھی۔ اس وصفِ خاص کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب کی کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں خوش مزاجی کا پہلو نہ ہو۔ کوئی قصہ ایسا نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے۔ بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مسلّمی شاگردوں سے نفرت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ 'ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں'۔''
>
> (ص 29)

مولوی نذیر احمد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے میں جہاں جانبداری سے کام لیا گیا ہے وہیں غیر جانبداری کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی شخصیت کی ہو بہو تصویر پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔

عبدالرزاق کانپوری۔ سرسید احمد خاں کے معاصرین میں سے تھے۔ انہوں نے سرسید اور انکے رفقا کو قریب سے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان بلند مرتبہ

Scanned with CamScanner

خطاب واعزاز یافتہ ادیبوں اور سیاستدان اشخاص کو "یادایام" (1945ء) میں قلمبند کر کے ان کی شخصیت و سیرت کو زندہ جاوید بنا دیا۔ ان میں سرسید اور خاں، شمس العلما شبلی نعمانی، خان بہادر علی خاں، محسن الملک بہادر، خان بہادر مفتی ذکاءاللہ، شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی، شمس العلما حافظ ذپٹی نذیر احمد، شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی، نواب وقار الملک، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، نواب مسعود جنگ بہادر، سر سید راس مسعود وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

"یادایام" راس مسعود کی فرمائش پر لکھی گئی، جو تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔ اس میں سرسید اور ان کے رفقا کے آپسی خلوص و محبت اور ان کی وضع داری، شائستگی کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ اشخاص کا تعارف بھی بڑی عمدگی سے کروایا ہے۔ محسن الملک بہادر کا تعارف یوں پیش کرتے ہیں:

"تعلیم یافتہ طبقے میں وہ کون شخص ہے جو محسن الملک کے نام اور ان کی قومی خدمات سے واقف نہ ہو۔ لیکن اس موقع پر ہم چند سطروں میں ان کا تعارف کراتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کے نورتن میں محسن الملک کا درجہ بہت بلند ہے اور سرسید کی طرح وہ خود بھی اصطلاحی معنی میں ایک بڑے شخص تھے۔ جن کا ایثار اور قومی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔" (ص 272)

مولوی وحید الدین سلیم "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ سے خواہش ظاہر کی کہ ان کا بھی خاکہ لکھیں۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد "وصیت کی تعمیل" کے نام سے ایک خاکہ لکھا گیا۔ اسکے علاوہ "یادایام عشرت" میں بھی خاکہ نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دوست احباب اور اساتذہ کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا۔ "دہلی کے آخری مشاعرہ" میں شعرا کی تخیلی تصویر کشی بڑی جاندار طریقے سے کی ہے، جس سے شعرا کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ گویہ خاکے مختصر ہیں لیکن مفید ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. خاکہ نگاری کی مستحکم بنیاد کسے کہا گیا ہے؟
2. 'یادایام' کس کی فرمائش پر لکھی گئی۔

3.4 خاکہ نگاری کا ارتقا

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کی طرف توجہ کی ان میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، اور مالک رام کے نام قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کا ایک بہترین نمونہ "چند ہم عصر" مولوی عبدالحق کے قلم کا مرہون منت ہے۔ بلند قامت مشاہیر، نواب محسن الملک، سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، مولوی چراغ علی، مولانا حالی، مولانا محمد علی، سرسید، سید محمود، اقبال و دیگران ان کے حسن انتخاب کی داد چاہتے ہیں، لیکن مولوی عبدالحق نے ہندوستانی سماج کے دیگر محنت کش افراد کی بے پناہ دیانتداری اور فرض شناسی کو بھی اپنا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ نام دیومالی اور 'نور خان' سپاہی مولانا کے دل کے نہاں خانوں میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اور وہ انہیں دیگر مشاہیر سے کم نہیں گردانتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے خاکے کے ابتدائی جملے مولوی عبدالحق کے مطمح نظر کی عکاسی کرتے ہیں اور لوازمات فن بھی واضح ہو جاتے ہیں:

"تصویر جس قدر بڑی، شاندار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارنمایاں کیے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

DATE :

URDU- HC-202

(۱) ’’ہاسٹل میں ہڑبونگ‘‘ کس کا خاکہ ہے؟

(الف) ڈپٹی نذیر احمد (ب) بطرس بخاری (ج)

(۲) یادگارِ غالب کس نوعیت کی کتاب

(الف) خاکہ (ب)

خطاب واعزاز یافتہ ادیبوں اور سیاستدان اشخاص کو ’’یادایام‘‘ (1945ء) میں قلمبند کر کے ان کی شخصیت وسیرت کو زندہ جاوید بنا دیا۔ ان میں سرسید احمد خاں، شمس العلما شبلی نعمانی، خان بہادر علی خاں، محسن الملک بہادر، خان بہادر منشی ذکاءاللہ، شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی، شمس العلما حافظ ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی، نواب وقار الملک، مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی، نواب مسعود جنگ بہادر، سرسید راس مسعود مرحوم وغیرہ شامل ہیں۔

’’یادایام‘‘ راس مسعود کی فرمائش پر لکھی گئی، جو تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔ اس میں سرسید اور ان کے رفقا کے آپسی خلوص ومحبت اور ان کی وضع داری، شائستگی کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ اشخاص کا تعارف بھی بڑی عمدگی سے کروایا ہے۔ محسن الملک بہادر کا تعارف یوں پیش کرتے ہیں:

> ’’تعلیم یافتہ طبقے میں وہ کون شخص ہے جو محسن الملک کے نام اور ان کی قومی خدمات سے واقف نہ ہو۔ لیکن اس موقع پر ہم چند سطروں میں ان کا تعارف کراتے ہیں۔
>
> سرسید احمد خاں کے نورتن میں محسن الملک کا درجہ بہت بلند ہے اور سرسید کی طرح وہ خود بھی اصطلاحی معنی میں ایک بڑے شخص تھے۔ جن کا ایثار اور قومی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔‘‘ (ص272)

مولوی وحیدالدین سلیم ’’نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی‘‘ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ سے خواہش ظاہر کی کہ ان کا بھی خاکہ لکھیں۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ’’وصیت کی تعمیل‘‘ کے نام سے ایک خاکہ لکھا گیا۔ اسکے علاوہ ’’یادایامِ عشرت‘‘ میں بھی خاکہ نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دوست احباب اور اساتذہ کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا۔ ’’دہلی کے آخری مشاعرہ‘‘ میں شعرا کی تخیلی تصویر کشی بڑی جاندار طریقے سے کی ہے؛ جس سے شعرا کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ گو یہ خاکے مختصر ہیں لیکن مفید ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. خاکہ نگاری کی مستحکم بنیاد کسے کہا گیا ہے؟
2. ’یادایام‘ کس کی فرمائش پر لکھی گئی۔

3.4 خاکہ نگاری کا ارتقا

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کی طرف توجہ کی ان میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، اور مالک رام کے نام قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کا ایک بہترین نمونہ ’’چند ہم عصر‘‘ مولوی عبدالحق کے قلم کا مرہون منت ہے۔ بلند قامت مشاہیر، نواب محسن الملک، سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، مولوی چراغ علی، مولانا حالی، مولانا محمد علی، سرسید، سید محمود، اقبال ودیگران ان کے حسنِ انتخاب کی داد چاہتے ہیں، لیکن مولوی عبدالحق نے ہندوستانی سماج کے دیگر محنت کش افراد کی بے پناہ دیانتداری اور فرض شناسی کو بھی اپنا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ’نام دیو مالی‘ اور ’نور خان‘ سپاہی مولانا کے دل کے نہاں خانوں میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اور وہ انہیں دیگر مشاہیر سے کم نہیں گردانتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے خاکے کے ابتدائی جملے مولوی عبدالحق کے مطمحِ نظر کی عکاسی کرتے ہیں اور لوازماتِ فن بھی واضح ہو جاتے ہیں:

> ’’تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تا کہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن وقبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارنمایاں کیے ہیں۔‘‘

Scanned with CamScanner

مولوی صاحب نے واضح طور پر یہ نکات آشکار کیے ہیں کہ شخصیت کے بارے میں بے لاگ رائے دینے سے خاکہ نگار قاصر رہتا ہے۔ موافق اور مخالف ان دونوں میں مبالغہ بھی ہو سکتا ہے۔ شخصیتیں مخلص اور بے نفس بھی ہوتی ہیں اور ریاکار و خود غرض بھی۔ علاوہ ازیں ہم عصر خاکہ نگار اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا محمد علی مرحوم کے تعلق سے مولوی صاحب رقم طراز ہیں:

''مولانا محمد علی عجیب و غریب شخص ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔''

گڈری کا لال نور خان کے بارے میں مولوی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے اپنے ضمیر کی آواز ہیں۔:

''حساب کے کھرے، بات اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، مرنجان مرنج، اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں، کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے۔''

ڈاکٹر عبدالحق کی اپنی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر پل اُردو کی خدمت میں گزرا۔

رشید احمد صدیقی کا نام خاکہ نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ گنج ہائے گراں مایہ (1937ء) ہم نفسانِ رفتہ اور ذاکر صاحب (1962ء) ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ علاوہ ازیں آشفتہ بیانی میری، شیخ نیازی اور مضامین رشید میں بھی دیگر مضامین کے ساتھ خاکے شامل ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ان کے بارے میں یوں رائے دی ہے کہ:

''رشید صاحب کے مضامین اور سوانحی مرقعوں میں تین چیزیں مشترک معلوم ہوتی ہیں۔ اول ذاتی تعلقات کا تانا بانا، دوسرے غنائیت کی لہر اور تیسرے بعض وہ عمومی (Generalized) نکتے اور بیانات جو مشاہدات اور تجربات زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتے ہیں۔''

یہی نکات خاکہ نگاری کے خواص یا لوازمات کے اہم عناصر ہیں۔ رشید صاحب نے ڈاکٹر عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد ندوی ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ایسے ہی کئی عالم و فاضل، مشاہیر اور اکابرین کے خاکے نہایت فنکاری کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔ لیکن ان کے خاکے کندن، محمد ایوب انصاری، اصغر سہیل اور ذاکر صاحب معرکے کی چیز ہیں۔ کندن کے اس خاکے کو پڑھنے سے نام دیو مالی اور نور خان کی تصویریں یاد آتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا پر جوش اسلوب اشخاص میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محمد علی کو ذہانت و فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغِ اصیل تھی۔ جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔ جو مخالفت کرتے تھے۔ ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دل دہی اور دل آسانی کرتے، ان کے لیے مارنے مرنے پر تیار رہتے۔ محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان کی مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی، کامیابی اور شہرت مدد لینے والے کی، وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور راحت عزیزاں تھے۔ ص 9

''محمد علی میں کمزوریاں تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا.....'' ص 10

رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ کئی سنجیدہ موضوعات اور نکات کو اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح قاری کے لیے لطف و انبساط کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

دلی کی عظمت رفتہ اور شاہی خاندان کی بیکسی و مجبوری کی تصویریں دیکھنی ہوں تو اشرف صبوحی کے خاکوں کا مجموعہ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ وضعداری اور غیرت مندی کے پتلے، فن اور ہنر میں ماہر کرداروں کو اشرف صبوحی نے اپنی لکسالی زبان میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''غبارِ کارواں'' ہے جس میں غیر معروف اور گمنام افراد کے خاکے ملیں گے۔ اردو کے مشہور شاعر چراغ حسن حسرت نے ''مردم دیدہ'' کے نام سے کئی شخصیتوں کے خاکے قلمبند کیے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی نے بامحاورہ اور لکسالی زبان میں کئی خاکے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں، ''زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ ان کا خاندانی وصف ہے۔'' ان کا مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' کے نام سے 1962ء میں اشاعت پذیر تھا۔ اس میں شامل سترہ خاکے شاہد احمد دہلوی کی فنکارانہ انفرادیت کے مظہر ہیں۔ ان کا اسلوب دلکش اور فطری ہے۔ بقول الطاف فاطمہ:

> ''اگر سچ پوچھا جائے تو خاکہ نگاری کا صحیح فن اور تصور ہمیں شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری ہی میں ملتا ہے۔ ان کے قلم کو اگر ہم کیمرے کا لینس کہیں تو بیجا نہ ہوگا اور لینس بھی حساس ترین۔''

شاہد احمد دہلوی نے جگر مرادآبادی کے چہرے اور قد و قامت نیز مکمل حلیے کی جو تصویر کشی اپنے قلم کے کیمرے سے کی ہے، اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ نگاری اور مرقع کشی پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔

> ''کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری سے منہ اگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، پھر واں کالی داڑھی ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی، بر میں اچکن، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں پینٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد کا اٹاچی کیس''۔

خاکے کا ابتدائی جملہ قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ دو صفحوں کی مزید عبارت کے بعد انہوں نے جگر صاحب کے بارے میں جو لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ جب بھوپال میں دونوں کی ملاقات ہوئی، وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی غزل لکھ کر رسالہ ساقی کے لیے دی:

> ''بڑے خوش خط تھے جگر صاحب۔ جو انداز پرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی۔ مگر موتی جڑ دیے تھے۔ اختتام پر اپنے نام کا طغرہ بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست قلم سے بھی ٹپکتی تھی۔ کتنی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس ظاہرہ بدشکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کیا آبِ حیواں کی طرح دنیا کی تمام بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں؟''

یہی اسلوب ان کے دیگر خاکوں مثلاً میر ناصر علی، بیخود دہلوی، حسن نظامی، میراجی، کیف دہلوی، مرزا محمد سعید، استاد بندو خاں اور جمیل جالبی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ ان کی نثر کا اسلوب ہے جسے انہوں نے بڑی فنکاری سے برتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ:

> ''شاہد صاحب کے خاکوں کی اثر آفرینی، مقبولیت اور دلکشی کا ایک سبب ان کا اندازِ بیان اور طرزِ ادا ہے۔ ان کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کر سکے۔ جس کے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک طرف اس کی بھوک مٹا سکے دوسری طرف زبان کے چٹخاروں سے روحانی کیف حاصل کر سکے۔ میں شاہد صاحب کی نثر کو اسی ذائقہ اور چٹخارہ کے لیے پڑھتا ہوں تاکہ جدید نثر کے صحرائے اعظم کی تپش اور جھلسا دینے والی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لیے عافیت پا سکوں۔''

ہے۔ بزرگوں سے لے کر آج تک زبانوں کی تحقیقات میں سرگرمی اور جستجو رہی۔ اب چند سال سے معلوم ہوتا ہے
اس ملک کی زبان ترقی کے قدم برابر آگے بڑھا رہی ہے۔ یہاں تک کہ علمی زبانوں میں دخل پیدا کرلیا اور عنقریب
بارگاہ علم میں کسی درجہ خاص کی کرسی پر جلوس کیا چاہتی ہے۔''

نثر کی بہ اعتبار معنی دو قسمیں ہیں سلیس اور دقیق۔ سلیس وہ جس کے معنی سہولت کے ساتھ سمجھ میں آجائیں اور دقیق جس کے معنی دقت سے سمجھ میں آئیں۔ سلیس اور دقیق کے دو، دو حصے ہیں ایک سادہ دوسرے رنگین، ادبی نثر کی اولین شرط یہ ہے کہ وہ ادب کے تقاضوں کو پورا کرے۔ سچے جذبات اور احساسات نثر میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ نثر کا تعلق موضوع سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ادبی نثر کا بیان مدلل واضح اور تفصیلی ہونا چاہیے۔ اس میں سادہ نثر اور ادبی نثر کی گنجائش ہوگی۔ اچھی نثر کے دو اہم جزو ہوتے ہیں، خیال اور بیان۔ موجودہ دور میں ان دونوں پر یکساں توجہ دی جاتی رہی ہے جس میں داخلی کیفیات اور خارجی واقعات واضح منظم اور مربوط ہوتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1- نظم کسے کہتے ہیں؟

2- نثر کی تعریف لکھیے۔

3- مقفیٰ اور مسجع سے کیا مراد ہے؟

7.3 انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ دراصل مختصر نویسی کا اعجاز ہے اور مختصر نویسی کا فن ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ انشائیہ کا مفہوم اردو ادب میں کم و بیش وہی ہے جو انگریزی میں ایسّے (Essay) کا ہے جو فرانسیسی لفظ Essai کا مترادف ہے۔ عام طور پر لوگ انشائیہ، مضمون اور مقالہ میں زیادہ فرق نہیں کرتے۔ انشائیہ کی ساخت و بناوٹ، اس کے موضوع اور فنی محاسن کی روشنی میں کئی ایک بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کے منجملہ یہ بات سامنے آئی کہ انشائیہ ایجاز و اختصار کے باعث نثری اصناف میں زیادہ مقبول رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ ایسی ہلکی پھلکی صنف ہے جو کم وقت میں مکمل کی جاسکتی ہے۔ اس میں اظہار جذبات کی ترنگ صاف دکھائی دیتی ہے۔ انگریزی، ادب کے نثر نگار، بیکن نے انشائیہ کو ایسی مختصر سی تحریر کہا جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے حقیقت کا اظہار ہو۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے لیے غیر رسمی طریق کار اور شخصی ردعمل لازمی سمجھتے ہیں۔ مسرت بہم پہنچانا انشائیہ کا بنیادی کام ہے اس میں موضوع کی مرکزیت کے قطع نظر ضمنی باتوں کا داخلہ بھی ممکن ہے۔ انشائیہ کی عدم تکمیل بھی اس کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ دعوتِ غور و فکر دیتا ہے اور فرحت و انبساط سے ہمکنار بھی کرتا ہے۔ اس میں قواعد، ضوابط اور دلائل کی گنجائش نہیں۔ زبان و بیان کی ندرت و کمال بھی اس سے عیاں ہوگا۔ انشائیہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پھوٹ کر اپنا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت ہوتی ہے اور تہہ داری بھی، انشائیہ میں ہمیں مضمون نگاری کا شخصی انداز ملتا ہے۔ مصنف اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے۔ وہ اپنی معلومات کی اہمیت نہیں جتلاتا لیکن اپنے تجربات و احساسات کو بیان کرنے میں پس و پیش بھی نہیں کرتا، بہ الفاظ دیگر وہ انشائیہ کے ذریعے بے تکلف بے محابا طرز اظہار کو جنم دیتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی داخلی اور خارجی کیفیات کے ادا کرنے میں کسی طرح کی پابندی کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے سامنے نہ کوئی محتسب ہوتا ہے اور نہ نقاد، وہ بس اپنی دلی امنگوں آرزوؤں کو پیش کرنے میں لطف و انبساط محسوس کرتا ہے۔ بقول جے بی مورٹن ''انشائیہ نثر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے''۔ انشائیہ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ اپنی سرشت میں اتنا نازک ہوتا ہے کہ کسی قسم کا دباؤ یا بوجھ برداشت نہیں کرتا چنانچہ انشائیہ نگار اپنی بات کہنے کے لیے ناول یا افسانہ کی طرح کوئی خاکہ ڈھانچہ یا پلاٹ تیار کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی نقطہ نظر، منظر یا پس منظر کا پابند ہوتا ہے۔ کردار نگاری منظر نگاری کی جانب بھی رغبت نہیں دکھاتا ہے۔ وہ اپنی محفل آپ سجاتا ہے خود مقرر اور خود ہی سننے والا ہوتا ہے۔ گویا خلوت میں جلوت کے مزے لینا ہی اس کی عادت ہوگی۔ وہ اپنی دانست میں شاعرانہ ماحول کا خالق ہے اور انشائیہ کو غزل کے بطور پیش کرتا ہے، جس طرح

Scanned with CamScanner

غزل گو اشعار میں اپنے خیالات کی تشریح نہیں کرتا انشائیہ نگار بھی اپنے جذبات پڑھنے والوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کے لیے انشائیہ نگار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ انشائیہ میں کوئی خاص طرح کے تجربوں سے گزرے۔ انشائیہ نگار زندگی کی کشاکش، اس کی مختلف جہتوں سے ہر آن ہر لمحہ جھانکتا نظر آتا ہے۔ اس کی انفرادیت اور رنگارنگی صاف جھلکتی ہے۔ نظر صدیقی نے انشائیہ کے بارے میں کہا ہے:

''انشائیہ وہ صنف ہے، جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔''

سینٹ بیو کی نظر میں انشائیہ کو مختصر ہونا چاہیے لیکن یہ اختصار سطحی نہ ہو بلکہ جامعیت سے بھرپور پر مغز اور بصیرت افروز ہو۔ انشائیہ نگار انشائیہ کے اختصار کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگی کے کسی پہلو کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ وہ بظاہر تشنہ ہوگا مگر قارئین اس کے باقی پہلوؤں کو خود ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح انشائیہ نامکمل ہوتے ہوئے بھی مکمل ہوتا ہے۔ شاید انشائیہ کی یہ بے ترتیبی غیر سنجیدگی ہی اس کا حسن قرار پاتا ہے اور اس کا یہ غیر رسمی انداز بیان اس کی روح سے جدا نہیں۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعے انشائیہ نگار اپنا ایک ذاتی انفرادی اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔

انشائیہ کا ارتقا مختلف زبانوں میں مختلف انداز سے ہوا۔ اس کا تعلق یقیناً زبان کے مزاج، ذوق اور سماجی حالات و ماحول سے ہوگا کیونکہ انشائیے ذاتی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ اپنی فضا و طریق سے گتھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر انشائیہ کو اس ماحول و مزاج سے علیحدہ کر دیا جائے تو اس کا لطف و کیفیت کم ہو جائے گی۔ انشائیہ نگار بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں بیکن، براؤن، ایڈیسن، گولڈ اسمتھ، چارلس لیمب، میکالے، رسکن وغیرہ کے انشائیے بہت اہمیت کے حامل ہیں، فرانسیسی زبان میں مانٹین کو اولین انشائیہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ اُردو ادب میں انشائیہ کی شروعات کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا بعض حضرات ملاوجہی کی ''سب رس'' میں انشائیہ تلاش کرتے ہیں جبکہ سب رس تمثیلی تحریر ہے، اس میں رمز و کنایہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع'' انشائیہ کا اچھا نمونہ ہے۔ چونکہ نوطرز مرصع کا انداز بیان تصنع اور آورد کا سا ہے اس میں بے ساختگی نہیں اس لیے خالص انشائیہ کی ذیل میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح رجب علی بیگ سرور کے ''فسانہ عجائب'' میں بھی تصنع تکلف بناوٹ اور آورد نے انشائیہ کے وصف کو مجروح کیا ہے۔ اس لیے اسے بھی انشائیہ نہیں کہا جائے گا۔ ماسٹر رام چندر اور میر ناصر علی کی تحریریں بھی اسی ذیل میں دیکھی جائیں گی۔ غالب نے اپنے خطوط میں سادگی اور بے تکلف انداز اختیار کیا ہے چنانچہ ان تحریروں میں کسی حد تک انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ غالب کے بعد انشائیہ کے واضح نقوش سرسید احمد خاں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں مولانا حالی، ذکاءاللہ، محسن الملک وغیرہ نے بھی اپنے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ کا رنگ و آہنگ اختیار کیا، البتہ سرسید کے رفقا میں محمد حسین آزاد نے ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کا انداز اختیار کیا۔ بعد میں عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اور موجودہ دور میں مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کو اُردو کے کامیاب انشائیہ نگاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ کا نمونہ دیکھیے:

''میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا خدا نے پردہ ڈھک لیا، افوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اتارتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل میں یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا، کیوں رے شریر یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا، سبحان اللہ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے، بولا واہ! قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کی سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے، گدھے ہیں، جن پر علم فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے،

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کرسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان ایک مثل جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں....."

7.3.1 انشائیہ کی خصوصیات

انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ انشائیہ نگار کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہے بات کرسکتا ہے، وہ ہر عنوان کے تحت گفتگو کرسکتا ہے اور کسی بھی موضوع کو غیر جانبداری سے پیش کردیتا ہے۔ اس کو واقعات کے عمل اور ردعمل سے کوئی سروکار بھی نہیں۔ انشائیہ نگار زندگی کا نقاد ہے نہ مبصر وہ تو محض اپنے تجربات کی بات کہتا ہے۔ اس کا مقصد اصلاح ہے اور نہ ہی تبلیغ، وہ محض اپنی داخلی کیفیات اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کرنا جانتا ہے۔ شاید اسی لیے انشائیہ کو انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی بے پرواہ قسم کی اڑان کہا گیا ہے، انشائیہ کا سب سے بڑا وصف اس کا اسلوب ہے۔ واضح رہے کہ ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر فن میں جاذبیت، دلکشی اور تاثیر کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اسلوب میں مزاح و مذاق کی آمیزش، رنگ، جدت و ندرت کے ساتھ ساتھ شخصیت کے پرتو کا خاص دخل ہوگا۔ اسلوب میں شخصیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اس لیے اسلوب ہی کو آدمی کی شخصیت کا آئینہ قرار دیا گیا ہے۔ گو اسلوب الفاظ اور بیان سے وابستہ ہے لیکن اس کی اصل محرک تو وہ کیفیت ہے جسے فنکار محسوس کرتا ہے۔ گویا ادبی اسلوب کی تعمیر میں فنکار کی شخصیت، ماحول، نقطہ نظر اور نظریہ حیات جیسے عوامل راست کام کرتے ہیں۔ انشائیہ نگار اپنے اسی انداز بیان یا اسلوب کی نیرنگی سے امتیاز حاصل کرتا اور اس کی انفرادیت کے جوہر چمک اٹھتے ہیں۔ اعلیٰ اسلوب ہمیشہ انسانی حواس کو متاثر کرتا ہے۔ الفاظ و فقروں کے حسین دروبست سے فن کار وہ خوبیاں پیدا کرتا ہے جن سے ایک طرف قوت گفتار نمایاں ہوتی ہے تو دوسری جانب سماعت نغمہ ریزی سے دوچار ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنی طبعی ذوق و شوق سے تحریر میں رنگارنگی، شگفتگی، رعنائی، شائستگی کو سمو دیتا ہے۔ محمد حسین آزاد کے مطابق، انشائیہ نگار خوش مذاق اور خوش طبع ہوتا ہے، جمالیاتی رنگوں سے کھیلتا ہے، خیالات کے باغ میں گھوڑے دوڑاتا ہے اور خوبصورت پھولوں سے اپنی دنیا سجاتا ہے۔ خشک سے خشک موضوع کو بھی جمالیاتی چھڑکاؤ سے شگفتہ اور تروتازہ بنادیتا ہے اور یہ سب کچھ نرم و نازک لب و لہجہ اور پانی کے شیریں چشمہ کی طرح رواں دواں ہوتا ہے۔

انشائیہ کی ایک خصوصیت اس کا بے ربط ہونا بھی ہے۔ چونکہ انشائیہ نگار، انشائیہ کے لیے کوئی مربوط منظم پلاٹ یا اسکیم وضع نہیں کرتا اس لیے بے ترتیبی لازمی ہے۔ یہ کبھی ہی انشائیہ کا حسن اور اس کی خوبی ہے جبکہ مضمون و مقالہ نویسی کے لیے یہ عیب ہے۔ اسی بات کو ہمارے دانشوروں نے انشائیہ کی جان کہا ہے۔ جانسن اسے ذہنی ترنگ کا نام دیتا ہے کہ انشائیہ نگار کا بہکنا، منتشر الخیالی محض کیف و نشاط سے متعلق ہے۔ شاید اسی لیے اس کو ادب لطیف کا نام دیا گیا جس میں دلآویزی، تخیل پرستی، رمز و ایما اور خوش طبعی شامل ہوگی۔ انشائیہ میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کی گنجائش تو پیدا کی جاسکتی ہے لیکن یہ طریق کار، منہاج اس کے لیے لازمی نہیں۔ یہ تو انشائیہ نگار کے مزاج پر منحصر ہے۔ مصنف اپنے اظہار میں طنز و مزاح کا پہلو بھی اختیار کرسکتا ہے۔ مغربی انشائیہ نگاروں کے ہاں انشائیوں کے مختلف ڈھنگ اور نقطہ نظر ملتے ہیں جیسے بیکن کے ہاں فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ افادی پہلو بھی نظر آتا ہے، لاک اور براؤن کے انشائیے بھی اسی ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں جبکہ گولڈ اسمتھ کے انشائیے کسی حد تک زندگی کے مشاہدات سے متعلق ہیں البتہ چارلس لیمب کے ہاں ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ حزن و ملال کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے جبکہ کارلائل کے انشائیوں میں ماضی کے دھندلکوں کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان سب سے جداگانہ انداز کے انشائیے رسکن کے ہیں جن میں اخلاقی قدریں، جمالیاتی نقطہ نظر سے زندگی کو حسین و جمیل بنانے کا خیال، پاکیزہ اور روحانی ترقی کا نصب العین ملتا ہے۔ اُردو کے انشائیہ نگاروں میں بھی ایسے ہی مختلف الجہات اوصاف صاف نظر آتے ہیں۔ جن کے مشاہدات، ذاتی تجربات اور شخصی رجحانات سے متعلق ہیں۔ اُردو کے اکثر انشائیہ نگار اپنی من موجی طبیعت، شاداب تاثرات کے اظہار کے لیے مشہور ہیں۔ دراصل انشائیہ نگار کی تحریریں دل سے تعلق رکھتی ہیں ذہن یا دماغ سے ان کا دور سے واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں، اپنے تجسس اور طرز اظہار سے انہیں انوکھی غیر معمولی اور دوامی بنادیتا ہے۔ انشائیہ میں نفس مضمون کی بجائے عبارت آرائی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس میں استدلالی گفتگو اور منطقی بحث نہیں ہوتی اور نہ ہی تشریح و تفصیل کی گنجائش ہوگی۔ اس میں اختراعی تفکر و افراد اور ادراکی نوعیت غالب ہوگی۔ لطافت، دلفریبی، خوش طبعی، شگفتہ بیانی کے باعث شعور اور ذہنی بالیدگی کے تمام آثار انشائیے میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد اپنی خوشیوں میں اوروں کو بھی شامل کرنا ہے۔ انشائیہ کا مطالعہ ہماری کسی گمشدہ شے کی نہ صرف یاد دلاتا ہے بلکہ اس کے حاصل کرلینے کی مسرت سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ طنز و مزاح نگاروں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے انشائیہ

Scanned with CamScanner

10.2 سوانح نگاری کا فن

سوانح نگاری سے مراد کسی شخص کی سوانح عمری، سرگزشت یا حالات زندگی تحریر کرنا ہے۔ سوانح 'سانحہ' کی جمع ہے۔ سانحہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ظاہر ہونے والا' پیش آنے والا' وقوعہ اور ماجرا کے ہیں۔ عام استعمال میں ناپسندیدہ اور وحشت انگیز واقعہ کو سانحہ کہا جاتا ہے لیکن سوانح عمری اور سوانح نگاری کی اصطلاحات میں اس کے لغوی معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سوانح عمری کا مطلب ہے واقعات حیات' حالات زندگی یا زندگی کی سرگزشت جس میں اچھے برے، نرم گرم، تلخ و شیریں ہر طرح کے واقعات شامل ہیں۔ سوانح نگاری کو انگریزی میں Biography کہتے ہیں۔ Bio کے معنی حیات اور Graphy کے معنی نگاری (لکھنا) کے ہیں۔ اس طرح Biography کا مطلب ہے، حیات نگاری یعنی روداد زندگی تحریر کرنا۔

کسی شخص کی سوانح عمری لکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات یا آپ بیتی خود لکھے۔ اسے خودنوشت (Autobiography) کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی زندگی کے حالات کوئی دوسرا شخص لکھے۔ اسے سوانح نگاری کہا جاتا ہے۔

10.2.1 تعریف

مختلف ماہرین فن نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

Chamber's Encyclopaedia میں سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا فن کارانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس میں یہ اضافہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ سوانح عمری سے زیادہ دلچسپ شعبہ ادب میں نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ نوع انسانی کا دل کش ترین مرکز مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔''

اس تعریف میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ حالات زندگی کا بیان فن کارانہ انداز میں ہو، دوسرے یہ کہ دلچسپ اور پر لطف ہو۔

Cassel's Encyclopaedia of Literature میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔ اس کا مقصد جہاں تک ہو سکے دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ مورخ اور مصور دونوں حیثیتوں سے کام کرے۔ مصور کا فرض کیا ہوتا ہے؟ تصویر سازی کے لیے بیٹھنے والے شخص کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس سے ملتی جلتی ہو بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو۔ اور مورخ کا فرض کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک باتیں بیان کرنا اور حقائق کو قابل فہم انداز سے ترتیب دینا۔ حقائق کی محض فہرست مرتب کر دینا، جس میں فن کاری نہ ہو، تاریخ ہی ہے نہ سوانح عمری۔''

(بحوالہ ڈاکٹر صبیحہ انور' اُردو میں خودنوشت سوانح حیات' ص 43-42)

اس تعریف میں تین اہم نکات پیش کیے گئے ہیں:

1- سوانح نگاری کا تعلق تاریخ سے ہے۔

2- چونکہ یہ تاریخ کی شاخ ہے اس لیے اس میں تاریخ ہی کی طرح سچائی اور دیانت داری ہونی چاہیے۔

3- اس میں فن کاری یا فنی قدریں ہونی چاہئیں۔

آکسفورڈ ڈکشنری کی رو سے سوانح عمری ''بہ طور ادب کی ایک شاخ کے افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے۔'' یہاں سوانح نگاری کا تعلق ادب سے جوڑا گیا ہے۔ یعنی سوانح نگاری ادب کے دائرے میں شامل ہے۔

Scanned with CamScanner

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''سوانح عمری ایسا بیانیہ ہے جو کسی فرد کی زندگی اور شخصیت کی بازآفرینی اور اس کے عمل کو شعوری اور فن کارانہ انداز میں قلم بند کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔''

اس تعریف میں بھی سوانح نگاری میں ادبی اوصاف کی آمیزش پر زور دیا گیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق: ''سوانح عمری کسی شخص کی حقیقی زندگی کا حساب کتاب ہے۔''

انگریزی ادب میں ڈرائیڈن پہلا ادیب ہے جس نے 1683ء میں پہلی مرتبہ ''سوانح عمری'' کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس کی بیان کی ہوئی تعریف کے بموجب ''کسی خاص شخص کی زندگی کی تاریخ سوانح عمری ہے۔'' ڈرائیڈن نے سوانح عمری میں تاریخ کے عنصر کو شامل رکھا ہے۔

مشہور انگریزی ادیب جانسن نے سوانح عمری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''سوانح عمری بیانیہ تحریر کی مختلف اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔''

اُردو میں بھی مختلف اہل قلم نے سوانح نگاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے مخصوص نقطہ نظر سے اس صنف کی تعریف کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں سوانح عمری:

''صاحب سوانح کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور صاحب سوانح کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کوئی ایک سوانح حیات، صاحب سوانح کی مکمل ذہنی اور تاریخی تصویر پیش کر سکتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اچھی سوانح عمری ہمیں صاحب سوانح سے اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت شائد ذاتی ملاقاتوں سے نہ حاصل ہوتی۔''

اس تعریف کی رو سے سوانح عمری کسی انسان کی شخصیت کے ''پورے تعارف'' اور ''مکمل آشنائی'' کا وسیلہ ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی سوانح عمری کی ماہیت اور وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کسی بھی بڑے انسان کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی۔ اس کا ماحول اور اس کے ماحول سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک سوانح عمری کا مطالعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کی ہی زندگی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس سے وابستہ بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ ہے جس میں تاریخ و تہذیب دونوں ہی سمٹ آتے ہیں۔''

ڈاکٹر تنویر احمد نے سوانح عمری کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے اس میں صاحب سوانح کی زندگی کے علاوہ اس کے عہد کی تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

پروفیسر گیان چند جین اپنی تصنیف ''ادبی اصناف'' میں سوانح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے۔ پوری کتاب بھی۔ (گیان چند جین، ادبی اصناف۔ صفحہ 137)

آنسہ الطاف فاطمہ اپنی تصنیف ''اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' میں لکھتی ہیں:

''سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔''

Scanned with CamScanner

2. شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ کون ہے؟
3. سوانحی عناصر کے نقطۂ نظر سے شعرائے اردو کے کون سے تذکرے قابل ذکر ہیں؟
4. سرسید کی کن تصانیف میں سوانح نگاری کے واضح نقوش ملتے ہیں؟

11.3 اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا' عہد حالی و شبلی میں

اردو میں سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے ان کے بعد شبلی کا نمبر آتا ہے ۔اگرچہ ان مصنفین کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں بعض فنی اور اصولی کمزوریاں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود یہ اردو میں سوانح نگاری کے امام ہیں۔ان دو عظیم ادیبوں نے مغربی اثرات کو قبول کرتے ہوئے اردو ادب میں اس صنف کا معیار بلند کیا۔ذیل میں ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

11.3.1 حالی کی سوانح نگاری

حالی اردو کے پہلے جدید سوانح نگار ہیں۔انہوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں : (1) حیات سعدی (2) یادگار غالب (3) حیات جاوید۔ان میں حیات جاوید سعدی فارسی کے عظیم شاعر و نثر نگار سعدی شیرازی کی حیات اور کارناموں پر لکھی گئی ہے۔سعدی کے حالات زندگی تذکروں میں محفوظ نہیں ہیں۔تذکروں میں سعدی کی حیات کے بارے میں جو تھوڑا بہت مواد ملتا ہے وہ بھی رطب و یابس سے پُر ہے۔حالی نے تذکروں کی نامکمل معلومات اور سعدی کے کلام کی داخلی شہادتوں کے ذریعہ ان کی سیرت و اخلاق و اہم حالات کو مرتب کیا۔روایات کے ذخیرے میں سے انہوں نے غیر مستند روایات کو رد کیا اور صرف معقول باتوں کا انتخاب کیا۔حالی نے یہ کتاب 1884ء میں تصنیف کی۔اس میں انہوں نے معاصر شاعروں کا بھی تعارف کرایا ہے۔حیات سعدی میں حالی نے سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے ہیرو کے مزاج' اخلاق و عادات اور کردار پر سماجی احوال اور خارجی ماحول کا اثر دکھایا ہے۔شخصیت و کردار کی تشکیل میں طبعی اثرات کی کارفرمائی کو اردو سوانح نگاروں میں سب سے پہلے حالی نے محسوس کیا ہے۔اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔جس میں کسی شاعر کے اس قدر مفصل حالات زندگی و نیز اس کے کلام پر محققانہ تبصرہ یکجا ملتا ہے۔چنانچہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ کتاب ''شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری ہے'' (بحوالہ مہدی افادی' افادات مہدی صفحہ 14) واقعہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اردو میں سعدی پر ''حیات سعدی'' سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔

حالی کی تصنیف کردہ دوسری سوانح عمری ''یادگار غالب'' ہے۔یہ سوانحی عمری حالی کا فنی شاہکار ہے۔اس میں انہوں نے اردو کے مشہور شاعر غالب کی سوانح حیات لکھی ہے اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ بھی کیا ہے۔حالی نے یہ کتاب 97-1896ء میں لکھی۔حالی غالب کے ہم عصر اور شاگرد تھے۔اس لحاظ سے انہیں غالب سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔اگرچہ حالی کو غالب کی بے تکلف صحبتوں سے عرصہ دراز تک مستفید ہونے کا موقع ملا تھا اور انہوں نے غالب کو بڑے قریب سے دیکھا تھا لیکن اس تصنیف میں انہوں نے صرف ذاتی معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی سائنٹفک طریقہ کار سے کام لیا جو ایک اچھے سوانح نگار کے لیے ضروری ہے۔چنانچہ ایک جگہ اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں :

> ''میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا قلم بند کیا۔جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا۔'' (یادگار غالب۔دیباچہ)

''یادگار غالب'' میں حالی نے غالب کے خطوط اور مختلف بیانات کے حوالے سے بھی ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔حالی۔غالب کی نجی زندگی میں خاصے دخیل تھے لیکن انہوں نے غالب کے حالات جمع کرنے میں بڑی احتیاط اور اختصار سے کام لیا ہے۔یہ احتیاط بعض وقت ایک عیب معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی تصنیف میں اپنے استاد سے یگانگت کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا حتی کہ غالب کے ان

Scanned with CamScanner

ملفوظات و مطایبات کو بھی جمع نہ کیا جن کے متعلق خود ان کا خیال تھا کہ :

''اگر کوئی شخص غالب کے تمام ملفوظات کو جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرافت کی تیار ہو جاتی۔''

تاہم اپنی بعض فنی کمزوریوں کے باوجود غالب پر یہ ایک مستند اور جامع کتاب ہے اور اس کتاب سے ہی غالب کے دیگر سوانح نگاروں نے مدد لی ہے اور آج تک غالب کی اس سے بہتر سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔

حالی کی تیسری سوانحی تصنیف 'حیات جاوید'' ہے جو اردو کے مشہور ادیب اور مصلح قوم سرسید احمد خاں کی جامع اور مفصل سوانح عمری ہے۔ حالی سرسید کے خاص رفیق تھے۔ انہیں سرسید سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ تھا۔ اس محبت اور وابستگی کے سبب سرسید کے سوانح عمری کی تصنیف کے فرض سے عہدہ برآ ہونا بہت ہی مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ لیکن حالی چند ایک نقائص سے قطع نظر اس فرض سے نہایت سنجیدگی 'مہارت' خوبی اور ہنرمندی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

حیات جاوید میں حالی نے سرسید کی نجی اور عوامی زندگی کے تمام پہلوؤں اور واقعات کو بیان کیا ہے۔ سوانح نگاری کے مغربی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے موضوع کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں خاندان' معاشرت' ماحول' ماں کی تربیت وغیرہ کے علاوہ دوسرے اثرات کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سوانح عمری کے ہیرو کی وہ باتیں بھی لکھ دی ہیں جن پر اس کے معاصرین نے نکتہ چینی اور تنقید کی تھی۔ لیکن حالی اپنی طبعی شرافت اور نیک نیتی کے باعث اپنے موضوع کی کمزوریوں کے بیان کے ساتھ ان کی تاویلات بھی پیش کرتے ہیں جو سوانح نگاری کے اصول کے خلاف ہے۔ شائد اسی لیے شبلی نے حیات جاوید کو سرسید احمد خاں کی ''مدلل مداحی'' کہا تھا۔ لیکن اس سوانح عمری کا سب سے بڑا وصف اس کی جامعیت اور استناد ہے جس کی بنا پر اسے ایک بہترین سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حیات جاوید صرف سرسید کی سیرت' ان کے حالات اور ان کے کارناموں کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کے ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔

حالی نے سوانح نگاری کو بہ طور ایک خاص فن اپنایا۔ اردو میں اس کے واضح اور جدید نقوش انہوں نے ہی ابھارے۔ انہوں نے اردو میں اس صنف کی تہی دامنی کو محسوس کیا اور تین اہم مشاہیر کی سوانح عمریاں لکھ کر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ حالی سنجیدہ' متین' معتدل مزاج اور بردبار طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی تحریر کی دردمندی' سلامت روی اور توازن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی افتادِ طبع سوانح نگاری کے لیے عین مناسب اور موزوں تھی۔ حالی سوانح نگاری کے متعلق اپنا ایک نظریہ اور تصور رکھتے تھے۔ حیات سعدی کے دیباچے میں انہوں نے اپنے تصور سوانح نگاری کی وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک سوانح نگاری ایک افادی صنف ادب ہے۔ جو اصلاحی اور اخلاصی مقاصد کے تابع ہے۔ ان کا خیال ہے :

1. سوانح عمری تازیانہ عبرت ہے۔
2. اس سے سوئی ہوئی پسماندہ قوم کی رگ حمیت بیدار ہوتی ہے۔
3. اس سے نیکی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔
4. اچھائی برائی میں تمیز ہوتی ہے۔
5. اس کا مطالعہ بڑے بڑے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ حالی سوانح عمری کے ہیرو کے کردار کی مثبت خصوصیات کو ابھار کر آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا اور اس کے ذریعے قوم میں عمل کا جوش اور ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

11.3.2 شبلی کی سوانح نگاری

مولانا شبلی نعمانی اردو کے دوسرے اہم سوانح نگار ہیں۔ جنہوں نے متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔ شبلی اسلامی عظمت کے پرستار تھے۔ وہ ہمیشہ اسلام

Scanned with CamScanner

17.5 غالب کے تین خط

غالب نے سینکڑوں خطوط لکھے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے اب تک جتنے بھی خطوط ملے ہیں ان کو جمع کر کے شائع کیا۔ خطوط کی تعداد کل نوسو ہے۔ جن کو چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ یہاں نصاب میں شامل "غالب کے خطوط کے مجموعے" "اردوئے معلّی" سے نمونے کے طور پر صرف تین خط دیے جا رہے ہیں۔

17.5.1 بنام منشی ہرگوپال صاحب المخاطب بہ میرزا تفتہ

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے دیوان جمع کیے۔ اسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا، کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں اس کا نام دلی اور اس محلّہ کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب۔ کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کے اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو۔ خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارہ کو دیا۔

17.5.2 بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح

جانِ غالب۔ تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔ ع ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے۔

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہل دہلی یا ہندو ہیں اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی پوروا ہوا اب کہاں۔ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہے۔ بہرحال میگذرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا

ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنویں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو! میرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا' اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں' باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو' اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ' دھوبی واڑہ' رام جی گنج' سعادت خاں کا کٹرہ' جرنیل کی بی بی کی حویلی' رام جی داس گودام والے کے مکانات' صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں' دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے' نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الکزنڈر ہدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ ضرور مجھ کو خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

17.5.3 بنام مرزا حاتم علی صاحب مہر

مرزا صاحب۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کی آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر ان کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیا الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپیہ کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کو کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کے جواب چاہتا ہوں۔

غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنویں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک سے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو امیرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کی بانس نشیب تھا' اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں' باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو' اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ' دھوبی واڑہ' رام جی گنج' سعادت خاں کا کٹرہ' جرنیل کی بی بی کی حویلی' رام جی داس گودام والے کے مکانات' صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حُسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں' دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الکزنڈر مدرنی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہر ان کی مصاحبت نہیں ورنہ ضرور مجھ کو خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

17.5.3 بنام مرزا حاتم علی صاحب مہر

مرزا صاحب۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کی آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر ان کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاالدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپیہ کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کو کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کے جواب چاہتا ہوں۔

غزل

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

Scanned with CamScanner

اردو کا ٹامس گرے

پطرس بخاری

(یکم اکتوبر 1898ء - 15 دسمبر 1958ء)

- نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا اور قلمی نام پطرس
- پطرس یکم اکتوبر 1898ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔
- پطرس کا انتقال 15 دسمبر 1958ء کو نیویارک میں ہوا اور انھیں وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔
- پطرس کے والد کا نام سید اسد اللہ بخاری تھا۔
- پطرس نے میٹرک کا امتحان 1912 میں انٹر کا امتحان 1915 میں، بی اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور سے 1917 میں اور ایم اے انگریزی میں کیا تھا۔
- پطرس گورنمنٹ کالج کی میگزین 'راوی' کے مدیر 1919 میں مقرر ہوئے تھے۔ اس دوران انھوں نے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے استاد Peter Waticks کے قلمی نام سے مضامین لکھے تھے۔
- پطرس 26-1925 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔
- پطرس اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے جنرل سکریٹری 1955 میں منتخب کیے گئے تھے۔
- پطرس کے مزاح کی بنیادی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔
- پطرس اپنے طنز و مزاح کا نشانہ اپنی ذات کو بناتے ہیں۔
- مزاح نگاری پطرس بخاری کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت ہے۔
- پطرس بخاری کو اردو کا ٹامس گرے کہا جاتا ہے۔
- پطرس بخاری نے سب سے کم مضامین لکھ کر مزاح نگاری میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔

مضامین پطرس

- مضامین پطرس، پطرس بخاری کے 11 مضامین کا مجموعہ ہے۔
- پطرس بخاری نے مضامین پطرس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ

Scanned with CamScanner

حیوان ظریف

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

(1797ء-1869ء)

- غالب کا نام اسد اللہ خاں اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔
- ابتداً اسد تخلص کرتے تھے لیکن جب یہ سنا کہ کوئی اور شاعر بھی اسد تخلص رکھتا ہے تو خود کو متمیز کرنے کے لیے اس وقت سے غالب تخلص اختیار کرلیا۔
- غالبؔ 1212ھ مطابق 27 دسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔
- 15 فروری 1869ء کو دہلی میں وفات پاکر بستی حضرت نظام الدین میں مدفون ہوئے۔
- غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ اور عرفیت مرزا دولہا تھی۔
- غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا جو شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے دہلی آئے تھے۔
- غالب کا سلسلہ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔
- غالب دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی کا نام مرزا یوسف خاں تھا۔
- 1801ء میں جب غالب کی عمر چار سال کی تھی تو گولی لگنے کی وجہ سے والد کا انتقال ہوا تھا۔
- والدہ کا نام عزت النسا تھا۔
- غالب کے چچا کا نام مرزا نصر اللہ بیگ تھا۔ چچا نے ہی غالب کی پرورش کی تھی۔
- 1806ء میں جب غالب کی عمر نو (9) سال تھی چچا نصر اللہ بیگ بھی وفات پا گئے۔
- ابتدائی تعلیم غالب نے شیخ معظم سے حاصل کی۔
- فارسی زبان کی تعلیم غالب نے عبدالصمد سے حاصل کی جو پارسی نژاد تھا اور جس کا اصل نام ہرمز تھا۔
- غالب کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے 7 رجب 1225ھ مطابق 1810ء میں ہوئی تھی۔
- غالب کے سات (7) بچے پے در پے ہوئے تھے اور ساتوں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارفؔ کے دو بچوں پہلے حسین علی خاں جو چھوٹا لڑکا تھا اسے گود لیا پھر بڑے لڑکے باقر علی کو گود لیا تھا۔
- غالب نے دہلی کا سفر 1812ء میں کیا تھا اور تقریباً پچاس برس دہلی میں قیام کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

اردو کا برناڈ شاہ

الطاف حسین حالی

(1837ء-1333ھ)

- نام الطاف حسین تھا اور تخلص پہلے خستہ پھر حالی۔
- حالی پانی پت ضلع کرنال (پنجاب) میں 1253ھ مطابق 1837ء میں پیدا ہوئے۔
- حالی کا انتقال 13 صفر 1333ھ مطابق 31 دسمبر 1914 میں پانی پت میں ہوا۔
- حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا اور بڑے بھائی کا خواجہ امداد حسین مظہر
- حالی کے مورث اعلیٰ پیر ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہیں۔ انھیں کے نسبت سے حالی کو خواجہ الطاف حسین حالی کہا جاتا ہے۔
- حالی کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی لڑکی اسلام النسا سے حالی کی مرضی کے خلاف 1854 میں 17 سال کی عمر میں ہوئی تھی۔
- حالی کے دو بیٹے خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین تھے اور ایک بیٹی عنایت فاطمہ۔
- حالی کا سلسلہ حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے۔
- حالی کے درسی اساتذہ: قاری ممتاز علی، سید جعفر علی، مولوی ابراہیم انصاری، مولوی نوازش علی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولوی محبت اللہ، مولوی قلندر علی۔
- شاعری کے استاد: غالب
- حالی نے شاعری شروع کی تو اپنا تخلص خستہ رکھا مگر غالب کے مشورے سے تخلص بدل کر حالی بروزن غالب کر دیا۔
- مالک رام کا خیال ہے کہ حالی نے اپنا تخلص شیفتہ کی صحبت کی وجہ سے تبدیل کیا تھا۔
(مونوگراف خواجہ الطاف حسین حالی، ص 23، از شہزاد انجم، اردو اکادمی دہلی)
- حالی کے معنی ہیں میرا حال، خود کہا ہے:

اپنی روداد تھی جو عشق کی کرتے تھے بیاں
جو غزل کہتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

Scanned with CamScanner

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گذارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی مرتبہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے

جب ہم نے انٹرس پاس کیا تو مقامی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلّے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر ایک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ وہ لڑکا جسے آج تک کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے جس کی نشو و نما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے، چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے مطابق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا نہ سمجھا چونکہ ——— ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، اس لئے وظیفے کا ملنا بھی خصوصاً رشتہ داروں کے لئے جو رشتہ کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا، اور مرکزی رشتہ داروں نے اس کو پاسِ وضع اور حفظِ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی، اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف

ہماری بلکہ ملک و قوم کی اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہیں کی گئی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے، اب تو ایک غیر جانبدار ایماندار مصنّف یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی، اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہارات دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ تعلیم کے ساتھ فرصت کے لمحات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید و کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں، اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا، کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں کسی کا لڑکا بھی ابھی تک ولایت نہیں گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی، لیکن پھر بھی ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب، اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی، لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا، بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا، بعض نے شاہدرے اور شالامار کی رومان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے، اور اعلیٰ درجے

کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیحد موزوں ہے، اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں پڑھنے لکھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے، اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی، اگر وہ صرف ایک عام اور مہمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا، لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد صاحب پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر کی پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے، ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انھوں نے بیشمار غلط بیانیوں سے کام لیا، چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہوسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو اکثر شراب کے نشے میں چور کسی نالے میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزار بارہ سو روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں، یا پھر فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں داخل کیا جائے، لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور لیکن ہاسٹل ہرگز نہیں، کالج مفید مگر ہاسٹل مضر، وہ بہت ٹھیک مگر یہ ناممکن، جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں، اور رہیں ماموں کے گھر۔ اس سے تحصیل علم کا جو ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے یہ سوچا ماموں صاحب اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر کھپچھوندی جمنے لگی۔ سینما جانے کی کبھی کبھار اجازت مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ سیر نا ہمیں نہ آیا۔ کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو جسے تیرنا آتا ہو، وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے، اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں ان کے متعلق ہدایت بہت کڑی تھی۔ ہفتے میں دو بار خط لکھنا ضروری تھا سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے، گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی، یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی، یوں تو دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن زندگی میں جو ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیے، وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کس کمرے کے کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، گھر کا کونسا دروازہ رات کے وقت کھولا جا سکتا ہے کونسا ملازم ناموافق ہے؟ کونسا نمک حلال، جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں، لیکن پھر بھی روزانہ دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں، ہم ان کی زندگی پر رشک

کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے، اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔

چنانچہ گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں، گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہوسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز فقہ خیر پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا۔ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی، دو منٹ دیر سے پہنچا، صرف دو منٹ بس صاحب بس، پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے تار دے کر اس کے والد کو بلوایا، پولیس سے تحقیقات کرانے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا تو بیچارا بھی۔

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی اُن پر واضح نہ ہوئی، پھر ایک دن موقعہ پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارہ سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے ان کے رویہ سے تو مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپیہ اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا

انہیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گذر گئیں اور ہم نے پھر ماسول کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر آئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا، دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی آگئی تھی، پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں، اب ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہوا، اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ ہم کو محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالوں کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے، ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے جانتا ہے کہ والدین اغراض کے لئے واقعات کو ایک نئے اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس نئے پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بتاں داں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیران ماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمون پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقعہ دیں۔ میں نے کہا۔

"دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے، اب ایک تو اس کا دماغ ہے

ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ ایک اور بھی بات ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے، میں اس کو شخصیت کہتا ہوں اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ صرف دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت مکمل ہو۔ دماغ تو بیکار نہ ہونا چاہئے ورنہ انسان خبطی ہو جاتا ہے، لیکن اگر پھر بھی اگر ہو بھی ـــــ تو بھی ـــــ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ـــــ ٹھہریئے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد صاحب نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اسکے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے، سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے کیا سیرت سے تمھارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟

تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے؟

میں نے کہا۔ "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے۔

میں نے نسبتاً خفیف آواز میں کہا جی ہاں ـــــ"

یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزوں کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا، کاش میں نے اس وقت توجہ سے سُنا ہوتا۔

اس کے بعد سال بھر میں ماموں کے گھر میں ــــــ "زندگی ہے تو خزاں کے دن بھی گذر جائیں گے" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا، لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹی میں پہلے سے بھی زیادہ شدّ و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھنا، ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لاتا، جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا، اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے، اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بہت اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلباء سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی، شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے، کچھ عرصے کے بعد انھوں نے ایک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا، پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لیجانے کا حکم دے دیتے تھے۔

اُن کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی، ہرگز نہیں، حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اِتفاق یہ ہُوا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ بی اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا، اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی تین چار دفعہ یہی قصّہ ہوا تو گھر والوں نے میری اُمنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی، بی اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی پہلی جیسی وقعت اب نہیں رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دَور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے، اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں فیل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے، بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لئے ہم کچھ پاس ہی ہو گئے بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا، لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو، ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے، شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر اس میں کوئی سفر کر رہے ہوں نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔

اب ہم جب بی اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے سوچا کہ بی اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں معقول جواب نہیں دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے چنانچہ بی اے میں ہمارے مضامین انگریزی

تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے، گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے، ہماری قوتِ مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی، اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ بانٹ کر ان تینوں مضامین کو دیتا ——

آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے اور فرض کیجیے اگر میں وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو کہ ہوا یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کما حقہٗ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا، وہ تو ہونا ہی تھا۔ انگریزی ہماری مادری زبان نہ تھی، اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچیے گا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان میں صرف کرنا پڑا، وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کی بجائے، مگر خیر یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک عالم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے از حد حیرت کا موجب ہوا، اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت ڈھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رُو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔

ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں کامیابی حاصل کی، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں ہم چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ ہاں تک ہو سکے گا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں ——— لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا مشکل ہے، پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں پاس ہو گئے۔

۱۔ انگریزی، تاریخ، فارسی۔

۲۔ انگریزی، تاریخ۔

۳۔ انگریزی، فارسی۔

۴۔ تاریخ، فارسی۔

گویا جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے، وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لئے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کیا۔

۵۔ تاریخ میں فیل۔

۶۔ انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے، ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی

رہ گیا، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکہ لگ جائے گا، بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائینگے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے، یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس دفعہ پاس ہونے کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں، بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے، ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والد کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقع پر طبیعت پر بڑی الجھن ہوتی، مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے میں پرچوں میں کیا لکھ آیا ہوں ـــــ اچھی طرح جانتا تھا، ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمامتر تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں، آخری سالوں میں والد صاحب کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، لیکن ادھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں" "اجی صاحب کیا کہہ رہے ہو" "اجی یہ بھی کوئی بات ہے"

ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے ـــــ بہرحال اب کے گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی ہوئی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے

اگلے سال پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہتے، اب تو کالج میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے، اب بھی ہوسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں، اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کو ایک سال صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط جمع کیا۔ پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا۔ اور ان سے والد کو خط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو آپ ہاسٹل ضرور بھیج دیں، بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرضداشت بھجوا دیں۔ خود اعداد و شمار ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے طلبا پاس ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہوسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں، میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہی غرور و خوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے دل سے یہ شک رفع نہ ہوا، کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی، ہاسٹل میں جسے دیکھ کر بحر العلوم میں غوطہ زن ہے، باوجود اس کے باہر شہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خاموشی طاری رہتی کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے

ہاسٹل کے چمن میں نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے ہیں، کامن روم ہیں، غسل خانوں ہیں، برآمدوں ہیں، ہر جگہ لوگ فلسفہ، ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں جن کو ادب، انگریزی کا شوق ہے وہ رات کو آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبرا میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، تاریخ کے دلدادہ.....

والد صاحب نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار تھا کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی، اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کیلئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہوسٹل میں آرہے ہیں جس سے ہم نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے، اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے سپرنٹنڈنٹ صاحب جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے، اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔